



ذنبک کا معنی اور مسئلہ درود

غزالی زماں
علامہ سید احمد سعید کاظمی سرہ
متوفی: ۱۴۰۶ھ

از افادات



ناشر

تحریک اہلسنت
اتحاد

Click For More Books

پیش لفظ

غزالیؒ زماں حضرت علامہ سید احمد سعید شاہ کاظمی علیہ الرحمہ کی ایک تقریر جو کہ تحریر صورت میں ملی۔ ادارہ تحریک اتحاد اہلسنت نے چاہا کہ اہل علم حضرات کے استفادہ کے لئے اس کو مزید نشر کریں۔ لہذا اس کو دوبارہ بغیر کسی رد و بدل کے شائع کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبول فرمائے۔ آمین

خادم قطب مدینہ علیہ الرحمہ

محمد اقبال قادری

بسم الله الرحمن الرحيم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ ﷺ

عزیزان محترم! آپ کا ایک ہی مقام ہے اور وہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ پر، اللہ تعالیٰ کی توحید پر، اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ وحدہ لا شریک ہونے پر آپ کا ایمان ہے مگر یہ سمجھ لو کہ خدا تعالیٰ کی توحید، اس کی وحدانیت، اس کا وحدہ لا شریک ہونا، اس کا شریک سے پاک ہونا، دین کی بنیاد، دین کی روح، سارا دین، تمام احکام خداوندی، تمام اسلامی تعلیمات، پورا قرآن اور تمام شریعت مطہرہ جس دامن سے ملی ہے، اس دامن سے وابستہ رہو، یہ وابستگی تمہارا مقام ہے، اگر اس دامن پاک سے وابستگی میں ضعف پیدا ہو گیا تو سمجھ لو کہ کچھ بھی باقی نہیں رہا۔

میرے محترم بھائیو اور میرے پیارے عزیزو! آپ کو یقین کرنا ہوگا کہ ہمارے

لئے بے شک خدا کی توحید، اللہ کی الوہیت، اللہ کی وحدانیت، اللہ کی واحدیت، اس کا وحدہ

لا شریک ہونا، یقیناً دین کی بنیاد ہے، مگر آپ یہ دیکھیں کہ اس بنیاد کی بھی تو کوئی بنیاد ہے، دین کا مرکز ہے؟

میرے دوستو! قرآن دین کا مرکز ہے، شریعت محمدیہ دین کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے، اللہ کے احکام کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اور تمام آداب، عبادات، معاملات، تمام احکام، مسائل، دین کا ہر مسئلہ، دین کے اصول اور دین کے فروع سب کچھ ہمارے لئے دنیا و آخرت کی سعادت کے لئے ضمانت ہے، مگر یہ بتاؤ اس دین کی اصل کیا ہے؟ میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

دین کی اصل تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ ہے، عقیدہ توحید اللہ کی واحدیت، اس کی وحدانیت، کلام الہی، اللہ کے کلام کا ہم تک پہنچنا اور ساری شریعت کا ہم تک آنا سب کی بنیاد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ ہے، اللہ تو ازل سے ایک ہے مگر میرے دوستو! اللہ کے ایک ہونے کا علم ہمیں کس نے دیا؟ ہمیں کس نے بتایا؟ ہم نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے، ہم نے اللہ کا کلام سنا ہے؟ کیا اللہ نے ہمارے کان میں قرآن کو نازل کیا ہے؟ اللہ اکبر

میرے دوستو اور میرے محترم عزیزو! اللہ کی وحدانیت، اللہ کی واحدیت کا اعلان زبان نبوت سے کرایا گیا، اللہ نے قرآن اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا اور دین اپنے حبیب کی زبان سے ہم تک پہنچایا، جس زبان پاک نے دین ہم تک پہنچایا اور جس زبان پاک سے قرآن ہم تک پہنچا اور جس زبان پاک سے اللہ نے اپنی توحید کا عقیدہ ہم تک پہنچایا، ایمان سے کہنا وہ زبان مقدس اور وہ ذات مقدس اللہ کے نزدیک،

اللہ کی بارگاہ میں اتنی عظمت والی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کے لئے توحید کے مسئلے میں، دین کے مسئلے میں، قرآن کے مسئلے میں، اس ذاتِ مقدسہ کو ساری کائنات کے لئے قابلِ اعتماد قرار دیا اور معتمد علیہ بنایا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ معتمد علیہ نہ بناتا تو نہ توحید پر اعتماد ہو سکتا تھا، نہ قرآن پر اعتماد ہو سکتا تھا، توحید کا عقیدہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو بتایا۔

ایک بات عرض کرتا ہوں، کہنے والے کا جب تک اعتبار نہ ہو اور کہنے والے کی زبان کا جب تک اعتبار نہ ہو اور کہنے والے کی ذات پر جب تک اعتماد نہ ہو، ایمان سے کہنا کیا اس کی بات کچھ وزن رکھتی ہے؟ کوئی وزن نہیں رکھتی، کیوں؟

اس لئے کہ کہنے والے کی زبان کا وزن تو کہنے والے سے ہوگا، اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبِ پاک جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدسہ کو اتنا وزنی بنایا، اتنا کامل بنایا، اس قدر اکمل اور عظیم بنایا کہ تمام دین کا اعتماد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر، توحید کے عقیدہ کا اعتماد حضور کی ذات پر، سارے قرآن کا اعتماد حضور کی ذات پر، اسی لئے فرمایا: ”قل هو اللہ احد“ میرے محبوب! میری توحید کا، میری وحدانیت کا، میری واحدیت کا تو اعلان فرما دے، اگر زبانِ نبوت کو اللہ تعالیٰ قابلِ اعتماد نہ بناتا تو زبانِ نبوت سے اپنی توحید کا اعلان کیسے کراتا؟ قرآن اللہ کا کلام ہے ہمارا ایمان ہے لیکن ایمان سے کہنا اسی قرآن میں اللہ نے کیا فرمایا ”إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ“ (سورة الحاقة: ۶۹/۷۰، سورة التکویر: ۸۱/۱۹) قرآن تو رسولِ کریم کا قول ہے، ارے کلام تو اللہ کا ہے مگر قول رسولِ کریم کا ہے۔

یہ (قول) مصدر ہے معنی میں مقول کے ہے یعنی رسول کا کہا ہوا ہے، اگر رسول نہ کہیں تو ہم کو کیا پتہ یہ اللہ کا کلام ہے، آپ نے غور فرمایا؟ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ

رسول کی ذات کو اللہ نے قابلِ اعتماد بنایا کہ نہیں؟

بیشک بنایا، جب اللہ نے رسول ﷺ کی ذات کو قابلِ اعتماد بنایا تو میرے دوستو! تمہارے دین کی بقاء، سارے دین کا استحکام، رسول کی ذات کے استحکام اور قابلِ اعتماد ہونے پر ہے، اگر اس استحکام میں ذرہ برابر فرق آتا ہے اور رسول کے قابلِ اعتماد ہونے میں ذرہ برابر فرق آتا ہے تو دین کی ساری عمارت منہدم ہو کر رہ جاتی ہے، عمارت تو بنیادوں پر ہوتی ہے اور سب کی بنیاد زبانِ نبوت ہے، قرآن کی بنیاد زبانِ نبوت ہے، عقیدہ توحید کی بنیاد زبانِ نبوت ہے، جب تک رسول کی ذات مستحکم نہ ہو، قابلِ اعتماد نہ ہو، غلطی سے پاک نہ ہو، عیب سے پاک نہ ہو، خطا سے پاک نہ ہو تو دین کا کوئی جز متحقق نہیں ہو سکتا، سارے دین کا دار و مدار حضور ﷺ کی ذاتِ پاک پر ہے۔

میرے دوستو اور میرے پیارے عزیزو! جب یہ بات آپ کے ذہن نے قبول کر لی تو اب میں ایک بات عرض کرتا ہوں کہ میں آپ کے علاقہ میں جب آتا ہوں تو ایسے ایسے الفاظ سننے میں آتے ہیں اور ایسے سوالات میرے سامنے آتے ہیں، میں حیران ہو جاتا ہوں کہ یا اللہ میں کیا دیکھ رہا ہوں اور کیا سن رہا ہوں؟

ذنبک کی آیت اور اعتراض

پہلا سوال میرے سامنے یہ آیا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝ لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔

(سورۃ الفتح، آیت ۱-۲)

ہم نے آپ کو فتحِ مبین اس لئے عطا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہوں کو معاف کر دے۔

معلوم ہوا کہ رسول سے اگلے گناہ بھی ہوئے اور پچھلے گناہ بھی ہوئے، تو رسول گنہگار ثابت ہوئے کہ نہیں ہوئے؟ رہا معاف کرنے کا معاملہ، تو جب اللہ نے معافی کا اعلان فرمادیا تو گناہ ہوئے یا نہیں ہوئے، ایک ہی بات ہے۔ یہ اعتراض میرے سامنے آیا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ جل مجدہ ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ۔ (سورة النساء: ۱۱۶)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو تو معاف نہیں کرے گا اور شرک کے علاوہ جس کو چاہے معاف کر دے۔

تو صرف معافی سے تو بات نہیں بنتی، ارے معافی تو ہر ایک مسلمان کی ہو سکتی ہے، ہر ایک مومن کی ہو سکتی ہے، خواہ اس نے کروڑوں گناہ کئے ہوں تو اب معافی کی وجہ سے وہ گنہگاروں کی صفت تو بہر حال باقی رہے گا، یہ الگ بات ہے کہ معافی ہو جائے تو اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہم یہی عقیدہ رکھیں کہ ان سے اگلے گناہ بھی ہوئے اور پچھلے گناہ بھی ہوئے اور اللہ نے معاف کر دیئے، اللہ تعالیٰ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے بہت سے لوگوں کے گناہ معاف کر دے گا اور بہت سے لوگوں کو بے حساب جنت میں داخل فرمائے گا، تو پھر بتائیے کہ وہ امتی اور رسول تو یکساں ہو گئے، رسول کے بھی گناہ معاف ہوئے اور ان کے بھی گناہ معاف ہوئے، تو پھر کیا فرق رہا رسول میں اور گنہگاروں میں؟

عزیزانِ محترم! افسوس صد افسوس! میں یہی عرض کر رہا تھا کہ میری آنکھیں کیا

دیکھتی ہیں اور میرے کان کیا سنتے ہیں؟ میں حیران ہوں!

Click For More Books

<https://archive.org/details/@zohaibhasanattar>

آدم علیہ السلام کا معاملہ

مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا علیہما السلام کو جنت میں رکھا اور ارشاد فرمایا: وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ۝ (سورة البقرة: ۳۵، سورة الاعراف: ۱۹) اے آدم و حوا اس درخت کے قریب نہ جانا اگر تم اس درخت کے قریب گئے تو ظالمین میں سے ہو جاؤ گے، یہ قرآن میں صاف صاف اعلان فرمایا، لیکن ہوا کیا؟ ”فَازْلَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا“ شیطان، آدم اور حوا دونوں کے قدم پھسلنے کا سبب بن گیا، پھر کیا ہوا؟ آدم بھی اور حوا بھی دونوں جنت سے باہر تشریف لے آئے۔

اب لوگوں نے کہا کہ دیکھئے شیطان نے پھسلا دیا، یہ گناہ نہیں تو اور کیا ہے، جنت سے باہر آ گئے، یہ گناہ کی سزا نہیں تو اور کیا ہے؟

میں عرض کروں گا واللہ باللہ ثم تالله یہ گناہ نہیں، یہ معصیت نہیں، گناہ اور معصیت کی تعریف کیا ہے؟ خوب سمجھ لو، گناہ اور معصیت کے معنی یہ ہیں کہ جو کام جان بوجھ کر معصیت کے ارادے سے کیا جائے اسے معصیت کہتے ہیں، اگر جان بوجھ کر معصیت کا ارادہ نہ ہو تو وہ کام معصیت کے مشابہ تو ہو جائے گا مگر معصیت کی حقیقت اس میں نہیں پائی جائے گی۔

روزہ دار کا بھول کر کھانا پینا

میں مثال دیتا ہوں بتائیے! روزہ دار کو روزہ کی حالت میں کھانا پینا کیسا ہے؟ یہ گناہ ہے یا نہیں؟ اگر روزہ دار روزے کی حالت میں جان بوجھ کر کھاپی لے تو بتائیے اس پر کفارہ ہوگا کہ نہیں؟ ساٹھ روزے رکھنے پڑیں گے، جان بوجھ کر کھایا پیا تو یہ گناہ ہوگا، اور اگر کسی روزہ دار نے بھول کر کھانا کھالیا یا پانی پی لیا تو گناہ نہیں ہوگا، فعل دونوں کا یکساں

ہے، فرق یہ ہے کہ ایک جان بوجھ کر کھاپی رہا ہے اور ایک بھول کر کھاپی رہا ہے، دونوں کا فعل تو ایک جیسا ہے مگر حکم بدل گیا، کیونکہ جو کام اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف جان بوجھ کر کیا جائے وہ معصیت ہے اور جو بھول کر کیا جائے وہ معصیت نہیں ہے، یہ فرق آپ کو سمجھ آ گیا۔

حضرت آدم و حوا علیہما السلام دونوں کے متعلق ایک بات عرض کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ“ اس درخت کے قریب مت جانا، اگر تم گئے تو کیا ہوگا؟ ”فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ“ تو تم ظالمین میں سے ہو جاؤ گے، اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر قصداً جان بوجھ کر بقصد معصیت اس درخت سے کھایا اور اس کے قریب گئے تو یقیناً تم گنہگار ہو جاؤ گے، ظالم ہو جاؤ گے، لیکن کیا اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم بھول کر بھی گئے، تب بھی ظالم ہو جاؤ گے؟ یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا، کیوں؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا“ (سورۃ البقرہ:

۲۸۶) اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، کسی کام کو جان بوجھ کر کرنا یا نہ کرنا یہ تو وسعت میں ہے، مگر بھول کر کرنا یا نہ کرنا یہ تو وسعت نہیں ہے، تو معلوم ہوا کہ ”وَلَا تَقْرَبَا“ کے معنی یہ ہیں کہ قصداً اس کے قریب مت جانا اگر قصداً گئے تو تم ظالمین میں سے ہو جاؤ گے۔

اب قرآن سے پوچھو کہ آدم و حوا علیہما السلام قصداً گئے اور حضرت آدم نے جان بوجھ کر اس درخت سے کچھ کھایا یا بھول گئے؟ میں نہیں کہتا، قرآن کہتا ہے: ”وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ فَتَنَىٰ وَلَمْ يُجِدْ لَهُ عَزْمًا“ (سورۃ طہ: ۱۱۵) ہم نے آدم سے ایک عہد لیا وہ کیا تھا؟ کہ اس درخت کے قریب مت جانا، ”فَتَنَىٰ“ تو آدم بھول گئے ”وَلَمْ يُجِدْ لَهُ عَزْمًا“ اور ہم نے آدم کا کوئی عزم نہیں پایا، کوئی قصد نہیں پایا، وہ

بھول گئے اور بھولنے کا سبب شیطان ہوا اور فعل کی اسناد کبھی سبب کی طرف کی جاتی ہے تو ”فَازَلَهُمَا الشَّيْطَانُ“ کے معنی یہ ہیں کہ شیطان ان کے بھولنے کا سبب ہو گیا اور بھول کر انہوں نے اُس درخت (کا دانہ) کھا لیا اور بھول کر جو کام کیا جائے وہ اگرچہ قصداً کرنے سے معصیت تھا لیکن جب بھول کر کیا گیا تو خدا کی قسم وہ معصیت نہیں ہوا تو قرآن نے کہا ”فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا“ آدم بھول گئے، ہم نے ان کا ارادہ نہیں پایا اور جو کام بھول کر ہو، ارادے کے بغیر ہو وہ معصیت نہیں ہوتا، وہ گناہ نہیں ہوتا، وہ ذنب نہیں ہوتا۔

اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ“ (سورۃ طہ ۱۲۱) آدم علیہ السلام نے اپنے رب کا عصیان کیا، وہ عصیان حقیقتاً نہ تھا بلکہ صورتاً تھا تو پتہ چلا کہ عصیان صورتاً ہو سکتا ہے مگر حقیقتاً نہیں ہو سکتا، اسی طرح ذنب صورتاً تو ہو سکتا ہے مگر حقیقتاً نہیں ہو سکتا اور صورتاً کیوں ہو سکتا ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جل مجدہ بعض اوقات اپنے نبیوں سے ایسا کام سرزد کر دیتا ہے جو حقیقتاً گناہ نہیں مگر مشابہ ہے گناہ کے تاکہ جب نبیوں کی امتوں کے اصل گناہ سامنے آئیں گے تو نبیوں کے ان افعال کے دامن میں امتیوں کے گناہ آجائیں گے، اللہ تعالیٰ انبیاء کے ان افعال کے دامن میں ان کو لے لے گا۔ کون سے افعال؟ جو حقیقتاً گناہ نہیں ہیں مگر صورتاً گناہ کے مشابہ ہیں، آپ کے دامن میں امت کے حقیقی گناہوں کو اللہ تعالیٰ لے لے گا اور حقیقی گناہوں کو لے کر امت کو بخش دے گا تو بخشش امت کی ہوگی اور نبی سے تو گناہ ہوا ہی نہیں ہے، وہاں تو گناہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی طرح ہمارے آقا، سرورِ عالم، نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض ایسے امور سرزد

ہوئے جو حقیقتاً گناہ نہیں، ذنب نہیں، معصیت نہیں بلکہ وہ صورتِ مشابہ ہیں گناہ کے اور اس لئے کہ میرے محبوب! تیرے اس فعل کے دامن میں تیری امت کے حقیقی گناہوں کو معاف کر دیا جائے، کیوں؟

تاکہ استغفار سنت بن جائے

اس لئے کہ ”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (سورۃ الاحزاب ۲۱) انبیاء کرام علیہم السلام ایسے کاموں پر استغفار کرتے رہے کہ جو حقیقتاً گناہ نہ تھے صورتِ مشابہ تھے اور جب ایسے کاموں پر استغفار کرتے رہے تو اُمت کو حکم تھا کہ جب وہ ایسے کاموں پر استغفار کرتے رہے جو حقیقتاً گناہ نہیں ہیں صرف گناہ کے صورتِ مشابہ ہیں تو اے میرے نبیوں کی امت والو! تم سے جب حقیقی گناہ سرزد ہوں تو تم کیسے استغفار نہیں کرو گے؟ تمہیں استغفار کرنا پڑے گا تو یہ امت کے لئے استغفار کا راستہ بتایا اور اپنے نبیوں کے اس فعل کے دامن میں اُمت کے ان افعال کو اور حقیقی گناہوں کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا، تو یہ اللہ کی حکمت ہے۔

میں نے ایک کلیہ آپ کے سامنے بیان کر دیا، اب جتنے جزئیات آپ لائیں گے اسی کلیہ کے تحت ہوں گے کہ کسی نبی کا کوئی فعل ہر گز گناہ نہیں ہوگا بلکہ اگر ہوگا تو گناہ کے مشابہ ہوگا اور مشابہ ہونے سے اُس کا حقیقتاً گناہ ہونا لازم نہیں آتا اور مشابہ اس حکمت کے لئے ہوگی کہ نبی کے ایسے فعل کے دامن میں اُمت کے حقیقی گناہوں کو لپیٹ کر مغفرت فرمادی جائے، یہ حکمت تھی۔

اب میری اس قید کا فائدہ آپ سمجھیں کہ نبی حقیقتاً گناہ سے پاک ہے، ہر نبی معصیت کی حقیقت سے پاک ہے اور کیوں پاک ہے؟ اس لئے کہ نبوت کے لئے عصمت

لازم ہے اور عصمت کے کیا معنی ہیں؟ کیا یہ معنی ہیں کہ گناہ کئے اور عصمت ہوگی؟ اگر یہ معنی لیں گے تو میں بڑا حیران ہوتا ہوں کہ یہ لوگ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم لوگ عصمت انبیاء کے قائل ہیں، ارے اللہ کے بندو! تم عصمتِ انبیاء کے کہاں قائل ہو؟ جب تم صاف صاف کہتے ہو کہ نبی سے پہلے گناہ ہوئے اور بعد کو بھی گناہ ہوئے تو جس سے گناہ ہوں وہاں عصمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تو پتہ چلا کہ ”مَا تَقْدَمُ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرُ“ کی نسبت اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کی طرف بھی بالفرض مان لوں تو حضور کے وہ مبارک افعال مقدسہ مراد ہیں کہ جن افعال مقدسہ کو ذنب نہیں کہا جائے گا، حقیقتاً بلکہ ان کے مشابہ، اس لئے کہ اُمت کے حقیقی ذنب ان کے دامن میں آ کر مغفور ہو جائیں گے۔

اعضائے وضو تین بار سے کم کیوں دھوئے؟

اب میں مثال تو نہیں دیتا مگر ذرا سی بات عرض کئے دیتا ہوں۔ حضور سرورِ عالم، تاجدارِ مدنی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعضاء وضو کو ایک ایک مرتبہ بھی دھویا، دو مرتبہ بھی دھویا اور تین مرتبہ بھی دھویا۔ (مشکوٰۃ، کتاب الطہارۃ، باب سنن الوضوء، فصل اول، ص ۴۶، عن ابن عباس مرة مرة عن عبد اللہ بن زید مرتین مرتین عن عثمان ثلاثا ثلاثا۔ مشکوٰۃ البانی، رقم: ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷) تین مرتبہ تو اکمل ہے، دو مرتبہ کامل ہے اور ایک مرتبہ جائز ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ہاتھ دھوئے، ایک مرتبہ کلی فرمائی، ایک مرتبہ بینی مبارک میں پانی ڈالا، ایک مرتبہ چہرہ مبارک کو دھویا، ایک مرتبہ کہنیوں تک مبارک نورانی ہاتھ دھوئے اور سرِ انور کا مسح تو ہوتا ہی ایک دفعہ ہے اور پاؤں شریف بھی ایک مرتبہ دھوئے، افضلیت بھی کم ہوگئی اور فضیلت بھی کم ہوگئی محض جواز کا مرتبہ رہ گیا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام کیوں کیا؟

مشکاۃ المصابیح، کتاب الطہارۃ، باب سنن الوضوء، الفصل الاول

مشکاۃ المصابیح، کتاب الطہارۃ، باب سنن الوضوء، الفصل الاول

اس لئے کہ اُمت سے اگر کہیں فرو گذاشت ہو جائے تو محبوب کے اس فعل کے دامن میں آ کر مقبول ہو جائے، کوئی ایک مرتبہ اعضاء کو دھو لے تو وضو تو پھر بھی ہو جائے گا مگر اس کا جواز کیسے ثابت ہوگا؟ میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان جواز کے لئے ایسا کیا اور بیان جواز تو منصب رسالت ہے اور منصب رسالت کی تکمیل تو بہت بڑا ثواب ہے، ہم تین مرتبہ اعضاء وضو دھوئیں اور حضور ایک مرتبہ دھوئیں تو حضور کا ایک مرتبہ دھونا ہمارے تین مرتبہ دھونے سے زیادہ ثواب رکھتا ہے جبکہ بیان جواز ہو۔

میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی طرف ذنب کو حقیقتاً منسوب کرنا اور یہ کہنا کہ حقیقتاً نبی سے گناہ ہوا، حقیقتاً نبی سے معصیت ہوئی تو یہ نبیوں کی عصمت کا انکار ہے اور عصمت نبوت کے لئے لازم ہے اور لازم کا انکار ملزوم کے انکار کی طرف منتج ہوگا تو لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نبوت کے انکار کا مرتکب ہوا۔ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں، عصمت کے معنی کیا ہیں؟ عصمت کسے کہتے ہیں؟

معصوم کے لئے گناہ پیدا ہونا شرعاً محال ہے

میں نہیں کہتا ”مسامرہ“ اُٹھا کر دیکھ لیں، ”مسایرہ“ اُٹھا کر دیکھیں ”شرح مواقف“ اُٹھا کر دیکھیں، یہ ہمارے علم کلام میں عقائد کی بڑی بڑی کتابیں ہیں۔ ان کے اندر صاف موجود ہے کہ عصمت کے معنی کیا ہیں؟ معصوم اسے کہتے ہیں کہ ”لم یخلق له ذنب“ (مسایرہ، مسامرہ، شرح مواقف، شرح مقاصد) ارے معصوم وہ ہے جس کے لئے گناہ پیدا ہی نہیں کیا گیا تو جب اللہ کی طرف سے گناہ پیدا ہی نہیں ہوا تو اب جو تم کہتے ہو کہ نبی سے گناہ ہوئے تو کیا تم نے پیدا کر دیئے؟

نبی کی شان یہ ہے کہ ”لم یخلق له ذنب“ ارے نبی وہ ہے جس کے لئے گناہ پیدا ہی نہیں کیا گیا، جب اللہ نے نبی کے لئے گناہ پیدا ہی نہیں کیا تو ”مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ“ کے معنی کیا ہوں گے؟ کیا یہ معنی ہوں گے کہ نبی نے گناہ کئے؟ ”لا حول ولا قوۃ الا باللہ“ ارے نبی کے لئے تو گناہ پیدا ہی نہیں ہوتا اور جب اللہ نے پیدا ہی نہیں کیا تو نبی سے گناہ کیسے سرزد ہوئے؟

گناہ پر قادر نہ ہونے اور گناہ کے پیدا نہ ہونے میں فرق ہے

اب میں ایک بات عرض کرتا ہوں یہ بڑی باریک علمی بات ہے، اہل علم اگر غور کریں گے تو ان شاء اللہ سمجھ میں آجائے گی، علم کلام کی کتابوں مسایرہ، مسامرہ، شرح مواقف، شرح مقاصد میں لکھا ہے کہ عصمت کے معنی ہیں ”لم یخلق له ذنب“ یعنی جس کے لئے گناہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس پر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جب گناہ پیدا ہی نہیں ہوا تو نبی کے اندر گناہ کی قدرت ہی نہیں اور جب نبی کے اندر گناہ کرنے کی قدرت ہی نہیں تو پھر گناہ نہ کرنا یہ کون سا کمال ہوا؟ سیدھی سی بات ہے، ایک شخص نابینا ہے تو وہ کہے کہ میں نے کبھی کسی کو بُری نظر سے دیکھا ہی نہیں تو لوگ کہیں گے کہ تم تو دیکھ ہی نہیں سکتے، یہ نہ دیکھنا تمہارا کوئی کمال نہیں ہے، کمال تو تب تھا کہ تم دیکھ سکتے، پھر نہ دیکھتے تو یہ جو تم نبوت کے لئے عصمت کے معنی بتاتے ہو اور معصوم کی تعریف کرتے ہو کہ ”لم یخلق له ذنب“ تو یہ تو کوئی کمال نہیں۔

اللہ اکبر! بھائی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کا ایمان سلب کرتا ہے تو عقل و علم بھی ساتھ سلب ہو جاتی ہے، میرے دوستو! اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کے لئے گناہ کا پیدا

نہ کیا جانے سے کیا یہ ضروری ہے کہ اس قدرت کو بھی اللہ نے سلب کر لیا ہو؟

محفوظ کے لئے گناہ پیدا نہ ہوا مگر شرعاً محال نہیں

خدا کی قسم! اس کا مطلب یہ نہیں ہے ورنہ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں بتائیے! ہزاروں اولیاء اللہ دنیا میں ایسے پیدا ہوئے کہ جنہوں نے گناہ نہیں کیا اور کیوں نہیں کیا؟ جنہوں نے گناہ نہیں کیا جو گناہوں سے محفوظ رہے، یہ بتائیے کہ اللہ نے ان کے لئے گناہ پیدا کیا تھا یا نہیں کیا تھا؟

تو میں عرض کروں گا اور صاف صاف لفظوں میں عرض کروں گا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جل جلالہ و عم نوالہ نے ان کے لئے گناہ پیدا نہیں کیا تھا، اگر اللہ ان کے لئے گناہ پیدا کرتا تو پھر ان سے گناہ کا صدور ضروری تھا تو پتہ چلا کہ ان کے لئے گناہ پیدا نہیں کیا گیا، اب آپ کہیں گے کہ یہ تو سارے معصوم ہو گئے، تو یہ غلط ہے کیوں غلط ہے؟

اس لئے غلط ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جل جلالہ نے جن کے لئے گناہ کو پیدا نہیں کیا ان کی دو قسمیں ہیں ایک قسم تو یہ ہے کہ جن کے لئے گناہ پیدا کیا جانا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے اور اللہ تعالیٰ نے قانون بنا دیا کہ ان کے لئے گناہ کا پیدا کرنا میری حکمت کے بالکل خلاف ہے اور کچھ ایسے لوگ ہیں ان کے لئے گناہ کا پیدا نہ کرنا کوئی محال شرعی تو نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی نیکی اور پاکی کی بنا پر ان کے لئے گناہ کو پیدا نہیں کیا لیکن یہ نہیں کہ ان کی شان یہ تھی کہ ان کے لئے گناہ پیدا نہ ہو یا ان کے لئے گناہ کا پیدا ہونا کوئی محال شرعی تھا۔ نبی کے لئے بھی گناہ پیدا نہیں ہوتا اور محفوظ ولی کے لئے بھی گناہ پیدا نہیں ہوتا۔

فرق اتنا ہے کہ نبی کے لئے گناہ کا پیدا ہونا محال شرعی ہے اور ولی کے لئے گناہ کا

نہ کیا جانے سے کیا یہ ضروری ہے کہ اس قدرت کو بھی اللہ نے سلب کر لیا ہو؟

محفوظ کے لئے گناہ پیدا نہ ہوا مگر شرعاً محال نہیں

خدا کی قسم! اس کا مطلب یہ نہیں ہے ورنہ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں بتائیے! ہزاروں اولیاء اللہ دنیا میں ایسے پیدا ہوئے کہ جنہوں نے گناہ نہیں کیا اور کیوں نہیں کیا؟ جنہوں نے گناہ نہیں کیا جو گناہوں سے محفوظ رہے، یہ بتائیے کہ اللہ نے ان کے لئے گناہ پیدا کیا تھا یا نہیں کیا تھا؟

تو میں عرض کروں گا اور صاف صاف لفظوں میں عرض کروں گا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جل جلالہ و عم نوالہ نے ان کے لئے گناہ پیدا نہیں کیا تھا، اگر اللہ ان کے لئے گناہ پیدا کرتا تو پھر ان سے گناہ کا صدور ضروری تھا تو پتہ چلا کہ ان کے لئے گناہ پیدا نہیں کیا گیا، اب آپ کہیں گے کہ یہ تو سارے معصوم ہو گئے، تو یہ غلط ہے کیوں غلط ہے؟

اس لئے غلط ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جل جلالہ نے جن کے لئے گناہ کو پیدا نہیں کیا ان کی دو قسمیں ہیں ایک قسم تو یہ ہے کہ جن کے لئے گناہ پیدا کیا جانا اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے اور اللہ تعالیٰ نے قانون بنا دیا کہ ان کے لئے گناہ کا پیدا کرنا میری حکمت کے بالکل خلاف ہے اور کچھ ایسے لوگ ہیں ان کے لئے گناہ کا پیدا نہ کرنا کوئی محال شرعی تو نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی نیکی اور پاکی کی بنا پر ان کے لئے گناہ کو پیدا نہیں کیا لیکن یہ نہیں کہ ان کی شان یہ تھی کہ ان کے لئے گناہ پیدا نہ ہو یا ان کے لئے گناہ کا پیدا ہونا کوئی محال شرعی تھا۔ نبی کے لئے بھی گناہ پیدا نہیں ہوتا اور محفوظ ولی کے لئے بھی گناہ پیدا نہیں ہوتا۔

فرق اتنا ہے کہ نبی کے لئے گناہ کا پیدا ہونا محال شرعی ہے اور ولی کے لئے گناہ کا

اب میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ ولی کے لئے اللہ تعالیٰ نے گناہ پیدا نہیں کیا، بولنے اس میں گناہ کرنے کی قدرت تھی یا نہیں تھی؟ ارے قدرت تو تھی مگر قدرت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ولی کی عظمت کی بنا پر اس کے لئے گناہ پیدا نہیں کیا، اگر اللہ گناہ پیدا کرتا تو وہ ضرور مرتکب ہو جاتا کیونکہ جس چیز کو جس کے لئے اللہ پیدا کرے وہ ضرور اس کا مرتکب ہوتا ہے۔

نبی خالقِ ہدایت نہیں بلکہ قاسمِ ہدایت ہے

اللہ نے جس کے لئے ہدایت کو پیدا کیا تو اس نے ہدایت کو اختیار کر لیا اور جس کے لئے ہدایت کو پیدا نہیں کیا اس نے کبھی ہدایت کو اختیار نہیں کیا اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ“ (سورۃ القصص ۲۸: ۵۶) میرے پیارے محبوب! ہدایت کا پیدا کرنا یہ تیرا کام نہیں یہ میرا کام ہے، میں نے ابوجہل کے لئے ہدایت کو پیدا نہیں کیا، اس لئے اس نے ہدایت کو اختیار بھی نہیں کیا، میں نے ابولہب کے لئے ہدایت کو پیدا نہیں کیا، اس لئے اس نے ہدایت کو اختیار ہی نہیں کیا، جس کے لئے خدا نے ہدایت کو پیدا نہیں کیا وہ ہدایت سے محروم رہا اور جس کے لئے خدا نے گناہ پیدا نہیں کیا وہ گناہ سے پاک رہا، فرق اتنا ہے کہ کسی کا گناہ سے پاک رہنا یہ شرعاً ضروری ہے اور کسی کا گناہ سے پاک رہنا شرعاً ضروری تو نہیں مگر اس کے فضل و کرامت کا تقاضا ہے کہ یہ گناہ سے پاک رہے۔ انبیاء علیہم السلام کے لئے گناہ مخلوق نہیں ہوا اور ان کے لئے گناہ مخلوق ہونا یہ شرعاً محال ہے کیونکہ عصمت لازمِ نبوت ہے مگر جس طرح گناہ کرنے کی قوت ولی کے اندر تھی نبی کے اندر بھی ہے، گناہ وہاں بھی مخلوق نہیں ہوا، گناہ یہاں بھی مخلوق نہیں ہوا تو گناہ کے پیدا نہ کئے جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قدرت ہی سلب ہوگئی، قدرت وہاں بھی ہے، قدرت

یہاں بھی ہے، کیونکہ قدرت گناہ نہیں ہے۔

میرے دوستو! گناہ کرنا گناہ ہے، اللہ تعالیٰ نے پاک کامل ولیوں کو بھی گناہ سے پاک رکھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبی کو گناہ سے پاک رکھا اور انبیاء کو اس لئے رکھا کہ ان کے لئے شرعاً ضروری تھا کہ گناہ سے پاک رہیں اور کامل اولیاء اللہ کو اس لئے پاک رکھا ان کے لئے حفاظت ان کی عظمت و شان کی دلیل تھی، تو نتیجہ یہ نکلا کہ اگر اللہ نے ان کے لئے گناہ کو پیدا نہیں کیا تو اس سے ان کی قدرت کا سلب ہو جانا لازم نہیں آتا اور قدرت کا سلب ہونا لازم نہیں آتا تو تمہارا یہ اعتراض بھی خاک میں مل گیا کہ جب قدرت ہی نہیں تو پھر گناہ کا نہ کرنا کمال نہیں ہے۔

ارے قدرت ہے، قدرت ہے، قدرت ہے مگر اس قدرت کو گناہ کے لئے استعمال کرنا نبی کے لئے مخلوق نہیں ہوا اور اس کا مخلوق ہونا شرعاً محال ہے، یہ دو فرق تھے جو میں نے آپ کو بتا دیئے۔

یہ تو علمی رنگ میں میں نے مسئلہ کو واضح کیا، اس صورت میں کہ جب ”ذنب“ کی اضافت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف واقعی حقیقی ہو لیکن یہاں ایک اور طریقہ سے عرض کئے دیتا ہوں۔

کر کے ”تمہارے گناہ“ مانگیں تمہاری پناہ

”لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ“ ذنب کے اندر تو ”دو“ اعتبار ہیں، دو احتمال ہیں ایک احتمال تو یہ ہے کہ ذنب فقط صورت ہو حقیقتاً نہ ہو، وہ تو انبیاء کی شان کے خلاف نہیں ہے، جیسے ابھی میں نے آپ کو بتایا، دوسرا احتمال یہ ہے کہ ذنب واقعی حقیقتاً گناہ ہو، اگر اس احتمال کو آپ لیتے ہیں آپ ذنب کے یہ معنی لیتے ہیں کہ وہ

گناہ بخش دیئے جو اگلے گناہ ہیں تو پھر یہاں پر مضاف محذوف ہوگا اور معنی یہ ہوں گے ”لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ أَوْ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ“ اگر ذنب سے مراد حقیقتاً گناہ ہے اور اگر ذنب کے حقیقی معنی مراد لئے جائیں تو امت کے گناہ مراد لینے پڑیں گے کہ اے میرے محبوب! میں نے جو فتح مسبین عطا فرمائی اس لئے کہ تیری امت کے اگلے پچھلے گناہ بخش دوں اور اگر ذنبک کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ صورتاً ہیں تو وہ انبیاء کی شان کے لائق ہے اور وہ اس لئے ہے کہ انبیاء کے اس فعل کے دامن میں امت کے حقیقی گناہ معاف کر دیئے جائیں، دونوں صورتوں میں معنی صادق ہیں ”لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ“ میرے محبوب! تاکہ اللہ تعالیٰ معاف کر دے ان گناہوں کو تیرے غلاموں کے جو تیرے اس ذنب کے دامن میں آگئے جو صورتاً ذنب ہے حقیقتاً نہیں اور دوسرے یہ کہ میرے محبوب! ہم نے فتح مسبین آپ کو عطا فرمائی تاکہ آپ کی امت کے اگلے پچھلے گناہوں کو ہم آپ کے لئے معاف کر دیں۔

دونوں توجیہیں صحیح ہیں اور کسی توجیہ کی بنیاد پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کا گنہگار ہونا ثابت نہیں ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ محمدیت، دامنِ نبوت، دامنِ رسالت اور دامنِ عصمت پر کسی گناہ کا دھبہ نہیں آتا اور جو لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے، یاد رکھو کہ وہ قرآن کو نہیں سمجھتے اور انہوں نے شانِ نبوت کو بھی نہیں سمجھا اور اب میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں یہ جو حقیقتِ حال آپ کے سامنے واضح ہوگئی تو اب آیتِ کریمہ کا مفہوم اپنے ذہن میں خوب پختہ کر لیجئے۔

عصمت کے مفہوم کو آپ کے سامنے ذرا واضح کرنا چاہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام واقعی گناہوں سے پاک ہیں، حقیقتاً گناہ کا کوئی اثر انبیاء پر نہیں آتا اور ہر نبی کا دامن گناہ کی

نجاست سے حقیقتاً پاک ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔

دیکھئے اگر انبیاء علیہم السلام کو آپ معصوم نہیں مانتے اور انبیاء کے لئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے گناہ ثابت کریں گے تو گناہ دو طریقے سے ہوگا، گناہ قول سے ہوگا یا فعل سے ہوگا، گناہ دو ہی باتوں سے ہوگا کسی نے جھوٹ بولا یہ قول ہے یا نہیں؟ کسی نے غیبت کی یہ قول ہے یا نہیں؟ کسی نے کسی پر بہتان لگایا یہ قول ہے یا نہیں؟ کسی نے لغویات بکے تو گناہ یا تو قول سے ہوگا یا فعل سے ہوگا، کسی نے رشوت لی، سود لے لیا، حرام کھالیا، کسی نے بے حیائی کا کام کر لیا، کسی نے شراب پی لی، یہ فعل گناہ ہیں یا نہیں؟ تو گناہ فعل میں ہوگا یا قول میں ہوگا دونوں سے الگ نہیں ہو سکتا، تو نتیجہ کیا نکلا؟

اگر نبی معصوم نہیں تو حکم اتباع و

اطاعت مستقل کیوں؟

نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ جل جلالہ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ”قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ“ (سورۃ آل عمران: ۳۱) میرے پیارے محبوب! ان سے فرما دیجئے کہ اگر تمہیں اللہ کی محبت کا دعویٰ ہے تو میری پیروی کرو، اب حضور کی پیروی یا تو قول میں ہوگی یا فعل میں ہوگی، اب اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گناہ سرزد ہونا ممکن ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میرے محبوب! نے کیا تو تم پر بھی فرض ہے کہ تم گناہ کرو، انہوں نے گناہ کی بات کہی، تم بھی گناہ کی بات کہو، انہوں نے گناہ کا کام کیا تم بھی گناہ کا کام کرو اور یہ بالکل محال ہے یہ بالکل ممکن نہیں تو پتہ چلا کہ نبی کا قول بھی گناہ سے پاک ہے نبی کا فعل بھی گناہ سے پاک ہے ورنہ ہم کو کیسے حکم دیا جاتا کہ ”فاتبعونی“ میری اتباع کرو، جب اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو ہم پر فرض قرار دے دیا تو معلوم ہوا کہ

وہ گناہ سے پاک ہیں ان کا قول بھی گناہ سے پاک ہے ان کا فعل بھی گناہ سے پاک ہے۔
سنئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ“ (سورۃ المائدہ: ۹۲، سورۃ النور ۵۴) لوگو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔ اطاعت کے کیا معنی ہیں؟ اطاعت کے معنی ہیں ”فرماں برداری“ یہ بھی دو ہی باتوں میں ہوگی جو رسول کہیں وہ مان لو اور جو رسول کر کے دکھائیں وہ کرلو، اطاعت بھی قول و فعل میں ہوتی ہے اور اتباع بھی قول و فعل میں ہوتی ہے۔ اب مجھے یہ بتائیے کہ اگر رسول کے قول و فعل میں گناہ سرزد ہوا ہو پہلے یا بعد کو، تو پھر ان کی اطاعت کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ تم بھی گناہ کرو اور گناہ کرنا فرض ہوگا، پھر جس بات کا کرنا فرض ہو وہ گناہ کیسے ہوگا؟ آپ ہی بتائیے؟ تو پتہ چلا کہ رسول گناہ سے پاک ہے، شاید آپ کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ یہاں تو تین باتیں ہیں ”أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ“ (سورۃ النساء: ۵۹) اللہ تعالیٰ تو خیر اللہ ہے، حضور گناہوں سے پاک ہیں چونکہ معصوم ہیں، نبی ہیں کہ ان کی اطاعت فرض ہے، تو اگر اطاعت فرض ہونے سے عصمت ثابت ہوتی ہے تو اطاعت تو اولی الامر کی بھی فرض ہے کیونکہ فرمایا اولی الامر کی بھی اطاعت کرو تو مطلب یہ ہوا کہ نبی بھی معصوم اور اولی الامر بھی معصوم۔

حالانکہ عصمت تو انبیاء کا خاصہ ہے اور جب انبیاء کا خاصہ ہے پھر اولی الامر تو معصوم نہیں ہو سکتے اولی الامر خواہ وہ مجتہدین ہوں یا وہ امراء ہوں کسی صورت میں بھی کوئی معصوم نہیں ہو سکتا۔

اس کا جواب دیتا جاؤں، وہ جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ”أَطِيعُوا“ کا لفظ دو جگہ فرمایا ”أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ“ اطیعوا اولی الامر نہیں فرمایا بلکہ اولی الامر کے

لئے اللہ نے صرف عطف فرما دیا اور دو جگہ اطیعوا فرمایا، کیا مطلب؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت بھی مستقل ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی مستقل ہے اور اولی الامر کی اطاعت مستقل نہیں ہے بلکہ اللہ و رسول کی اطاعت کے معیار پر دیکھ لو، اگر صحیح ہے تو کرو، نہیں ہے تو نہ کرو۔

لہذا نبوت کی عصمت ثابت ہوگئی، اولی الامر کی عصمت ثابت نہیں ہوئی۔ یہ بات آپ سمجھ گئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ“ (سورۃ النساء: ۶۴) ہم نے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جس کی اللہ کے اذن سے اطاعت نہ کی جائے، معلوم ہوا کہ ہر رسول مطاع ہوتا ہے اور اطاعت قول و فعل میں ہوتی ہے تو پتہ چلا کہ ہر رسول قول و فعل میں گناہ سے پاک ہے اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

”مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ“ (سورۃ النساء: ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کر لی تو اس نے اللہ کی اطاعت کر لی۔ اطاعت تو قول و فعل میں ہوگی تو پتہ چلا کہ رسول کے قول کی اطاعت کرنا رسول کے فعل کی اطاعت کرنا یہ اللہ کی اطاعت ہے۔

اب اگر رسول کے قول و فعل میں گناہ ہے تو ایمان سے کہنا کہ وہ گناہ کرنا کب اللہ کی اطاعت ہوگی؟ اس لئے پتہ چل گیا کہ رسول کی اطاعت مستقلاً فرض ہے اور رسول کی اتباع مستقلاً فرض ہے اور جب یہ مستقلاً فرض ہے تو نبی کا قول بھی گناہ سے پاک ہے، نبی کا فعل بھی گناہ سے پاک ہے اور یہ گناہ سے پاک ہونا ایسا ہے کہ گناہ ہونا نبی سے شرعاً محال ہے اور اس کا مخلوق ہونا بھی شرعاً محال ہے لہذا جس کے گناہ کا مخلوق ہونا شرعاً محال ہو وہی تو نبی ہوتا ہے اور استحالہ خلق ذنب سے قدرت کا سلب ہونا لازم نہیں آتا، قدرت اپنے مقام پر ہے ہم انبیاء کی قدرت کے منکر نہیں ہیں، ہاں! ہم انبیاء کی معصیت کے منکر ہیں ان کے

گناہ کے منکر ہیں کہ انبیاء سے گناہ نہیں ہوتا، انبیاء سے نافرمانی نہیں ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ انہیں قدرت دیتا ہے اور قدرت ہی کمال کا معیار ہے تو قدرت کی نفی نہیں معصیت کی نفی ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھ لیں اب جو بات میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، آپ اس پر غور فرمائیں۔

بعثت سے پہلے کافروں نے بھی بے گناہ مانا

میرے پیارے دوستو اور محترم عزیزو! آج اسلام کا دعویٰ کر کے ہم رسول کی معصیت ثابت کریں اور رسول کے لئے گناہ ثابت کریں تو ہمیں شرم نہیں آتی۔ قرآن اٹھا کر دیکھئے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس سال کی عمر شریف کے بعد جب نبوت کا اظہار فرمایا، نبوت کا دعویٰ فرمایا تو منکروں نے نبوت کا انکار کیا یا نہیں کیا؟ انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے پیارے حبیب یہ تیرے دعویٰ نبوت کا انکار کر رہے ہیں۔ ان کو ایک دلیل بیان کر دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ“ (سورۃ یونس: ۱۶) میرے پیارے ان سے کہہ دے کہ اس دعویٰ نبوت کے اظہار سے پہلے اپنی عمر کا چالیس برس کا حصہ تم میں گزار چکا ہوں، میری پیدائش مکہ معظمہ میں ہوئی، پیدائش تم پہ مخفی نہیں، میرا بچپن مکہ معظمہ میں گزارا وہ بھی تم پہ مخفی نہیں، لڑکپن میرا تم میں گزارا، میری جوانی کے لیل و نہار اور ایک ایک لمحہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے، میری چالیس برس کی عمر تم میں گزری، چالیس برس کی عمر ایک معیار ہے، اگر کوئی بھی عیب کسی میں چھپا ہوا ہو تو چالیس برس کی عمر تک وہ ضرور باہر آ جاتا ہے، تو چالیس برس گزر گئے اگر میرا کوئی عیب باہر آیا ہو تو بتاؤ؟ یہ دشمنوں کو، ابو جہل کو، ابولہب کو، عتبہ کو، شیبہ کو، یہودیوں کو، نصرانیوں کو، مشرکوں کو، بت پرستوں کو کہا گیا۔

اب آپ مجھے یہ بتائیں جب دشمنوں کے سامنے اپنے آپ کو پیش کر دیا جائے کہ نکالو کوئی عیب، نکالو کوئی گناہ ہے تو، اگر کوئی گناہ ہو تو دشمن اس کو بیان کرنے سے باز رہے گا۔

لیکن میرے دوستو اور عزیزو! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان دشمنوں کے سامنے چالیس برس کی عمر پیش کر دے اور ان سے کہو بتاؤ کوئی غلطی ہے تو نکالو، کوئی عیب ہے تو نکالو، خدا کی قسم دشمنانِ مصطفیٰ کو نہ ان کے بچپن میں عیب نظر آیا، نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لڑکپن میں عیب نظر آیا نہ حضور کی جوانی میں عیب نظر آیا، چالیس برس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کے کسی لمحہ میں دشمنوں کو عیب نظر نہیں آیا۔

بتاؤ جن سے اظہارِ نبوت سے پہلے کوئی گناہ نہیں ہوا، وہ اظہارِ نبوت کے بعد گناہ کے لئے رہ گئے تھے؟ سوچنے کی بات ہے، ارے اظہارِ نبوت کے بعد تو ان کی ذات پاک سے گناہ کا تصور ہی دور ہو گیا، کیونکہ گناہوں سے تو وہ روکنے آئے تھے اگر آپ گناہ کرنے بیٹھ جائیں تو بتائیے ان کی بعثت کا مقصد کیسے پورا ہوگا؟ اور جو ذات پاک اظہارِ نبوت سے پہلے گناہ سے پاک ہے خدا کی قسم! اظہارِ نبوت کے بعد تو بطریقِ اولیٰ گناہ سے پاک ہے، اس لئے یہ کہنا کہ ”مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ“ کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے اگلے پچھلے گناہوں کو معاف کر دیا، ارے وہ اگلے پچھلے گناہوں کا زمانہ تو بتاؤ کس زمانے میں وہ حضور سے گناہ ہوئے اور کیا گناہ ہوئے؟ ارے! دشمن میرے آقا کا گناہ نہ پکڑ سکے اور آج اسلام کا دعویٰ کرنے والے میرے آقا کے اگلے پچھلے گناہ کا دعویٰ کر رہے ہیں، قرآن کی آیت کا مطلب یہی ہے کہ میرے محبوب! ہم نے فتحِ مبین آپ کو عطا فرمائی تاکہ پیارے حبیب آپ کی امت کے گناہ آپ کے لئے ہم بخش دیں۔

یہ اس قابل نہیں کہ ان کو بخشا جائے، تیرے لئے بخش دیں، تیرے سبب سے بخشیں، تیرے لئے بخشیں گے، میرے محبوب! تیرے طفیل بخشیں گے، میرے پیارے حبیب! ہم تو تیرے لئے بخشیں گے کیونکہ ہم نے ان کو نہیں دیکھا ہم نے تو تیرا چہرہ پاک دیکھا ہے ہم تو تیرے لئے ان کے گناہوں کو بخشیں گے تو بتاؤ یہ میرے آقا کا احسان نہیں؟ کتنا بڑا احسان ہے جن کے لئے ہمارے گناہ بخشے گئے، اس احسان کا ہم نے یہی بدلہ دینا تھا کہ اُن کو ہی گنہگار ٹھہرا دیں؟ کتنا غضب ہے اور کتنا افسوس ناک ہے ایسا خیال۔

میں نے آپ کو تمام پہلو بتا دیئے اور دلیلوں سے ثابت کر دیا اور بتا دیا کہ نبی معصوم ہے کہ جس کے لئے گناہ پیدا نہیں ہوا اور شرعاً گناہ کا پیدا ہونا اس کے لئے محال ہے اور قدرت موجود ہوتی ہے۔ ہم قدرت کی نفی نہیں کرتے، ہم گناہ کی نفی کرتے ہیں معصوم وہ ہے جس سے گناہ سرزد نہ ہو اور میرے آقا معصوم ہیں ہر نبی معصوم ہے اور جس نبی کا کوئی گناہ یہ پیش کریں گے تو میں نے اس کا قاعدہ آپ کو بتا دیا کہ وہ حقیقتاً گناہ نہیں ہے بلکہ وہ گناہ کے مشابہ ہے اور مشابہ ہونا اس حکمت کے لئے ہے کہ امت کے گناہوں کو اس کے صدقے میں بخش دیا جائے اور امت کو استغفار کا حکم دیا جائے۔ انبیاء علیہم السلام بغیر حقیقتاً گناہ کے استغفار کر رہے ہیں تو تم حقیقتاً گناہ کر کے بھی استغفار نہ کرو، تو افسوس ہے تم پر تو نبی سیرت مکمل کرنے کے لئے اور نبی کے دامن میں امت کے گناہوں کی معافی کے لئے، ایک وسیلہ پیدا کرنے کے لئے اس قسم کے افعال نبیوں سے سرزد کرائے گئے جو حقیقتاً گناہ نہیں تھے، ہر نبی حقیقتاً گناہ سے پاک ہے اور میرے آقا پاک ہیں، طیب ہیں، طاہر ہیں۔ اب ”لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ“ کے معنی تو میں نے آپ کو بتا دیئے اور بہت وضاحت کے ساتھ بتا دیئے اور تمام کو میں نے مبرا بن کر دیا،

اگر کوئی مانتا ہے تو مانے، نہیں مانتا ہے تو نہ مانے، میں نے تو حقیقت کا اظہار آپ کے سامنے کر دیا۔

آپ ﷺ کی کوئی بات خطا نہیں

اب اس کے بعد دوسری بات عرض کرتا ہوں وہ تتمہ ہے اسی بحث کا، اور وہ تتمہ یہ ہے کہ کہتے ہیں بھئی دیکھو حدیث میں آیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دیکھو جو بات میں تم سے اللہ عزوجل کی طرف سے کہوں وہ مان لو اور جو اپنی طرف سے کہوں تو میں تمہاری طرح بشر ہوں تو ہو سکتا ہے کہ غلطی ہو جائے تو اس کا ماننا تم پر ضروری نہیں ہے جو بات میں تمہیں اپنی طرف سے کہوں۔ حدیث میں الفاظ ہیں ”انما انا بشر۔ (مشکوٰۃ، کتاب الایمان، باب الاعتصام والسنة، رقم: ۱۴۷۰۔ (حدیث ثابیر نخل)۔

اذا امرتکم بشیء من امر دینکم فخذوا به واذا امرتکم بشیء من رائی فانما انا بشر“ حدیث میں غلطی کا لفظ نہیں ہے لفظ بشر سے یہ غلطی کے معنی نکال لیتے ہیں، کہتے ہیں اگر واقعی حضور سے غلطی نہیں ہوئی، کوئی گناہ نہیں ہوا، تو یہ کیوں فرمایا کہ جو بات اللہ کی طرف سے کہوں وہ مان لو، اگر اپنی طرف سے کہوں تو میں تمہاری مثل بشر ہوں، اس حدیث کا کیا مطلب ہوا؟

آج میں اس حدیث کا مطلب سمجھا دینا چاہتا ہوں۔ عزیزان محترم! اب کیا کہا جائے جس قوم نے تہیہ کر لیا ہو کہ رسول کا کوئی احسان ہی نہیں مانیں گے تو اس قوم کا کیا علاج ہے؟ میرے دوستو! یہ جو حضور ﷺ نے فرمایا یہ امت پر بہت بڑا احسان ہے اور وہ احسان کیا ہے؟

”من جہت الرسالت“ اور ”من جہت البشریت“ یہ دو جہتیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادیں۔ ایک جہت بشریت کی ہے اور ایک جہت رسالت کی ہے فرمایا رسالت کی جہت سے جو بات کہوں گا ظاہر ہے وہ تو اللہ کی وحی سے ہوگی، اللہ کا حکم ہوگا اس کا ماننا تمہارے لئے ضروری ہے لیکن اگر کوئی بات میں اپنی بشریت کی طرف سے کہہ دوں تو اس کا ماننا تم پر ضروری نہیں، اگر تم اس کو نہ مانو اور اس پر عمل نہ کرو تو یہ اور بات ہے کہ تم برکت سے محروم ہو جاؤ لیکن تم گنہگار نہیں ہو گے۔ دو حیثیتیں میرے رب نے اس لئے عطا فرمائیں کہ جو بات من جہت رسالت سے کہوں اس کی پابندی تم پر لازم ہے اگر ہر بات جہت رسالت سے ہو تو جتنی باتیں کہوں گا سب تم پر فرض ہوتی چلی جائیں گی اور جو میں کروں گا سب تم پر لازم ہوتے چلے جائیں گے اور تم حد بندیوں میں مبتلا ہو جاؤ گے، تم پر بڑی قیدیں آ جائیں گی اور جتنی قیدیں بڑھیں گی اسی قدر تمہارے لئے مشکل ہوگی، تم ان قیدوں کو برداشت نہیں کر سکو گے تو پھر گناہ ہوں گے تم ان پابندیوں سے نکلو گے۔ نتیجہ کیا ہوگا کہ تم گناہوں میں مبتلا ہو جاؤ گے، اس لئے تم پر آسانی کے لئے دو جہتیں ہیں۔ رسالت کی جہت سے جو کام ہے وہ نہیں کرو گے تو گنہگار ہو گے مگر بشریت کی جہت سے کہہ دوں تو نہ کرنے سے گنہگار نہیں ہو گے، رسول اللہ کا بڑا کرم ہے، بڑا احسان ہے، تمہارے لئے آسانی کر دی، تو آسانی اور سہولت کرنے کا یہی نتیجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہم یہ کہیں کہ معاذ اللہ وہ ہم جیسے بشر اور غلط کار ہیں، ان کو غلطی کا مرتکب قرار دینا احسان کا بدلہ نہیں ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک

میں آپ کو ایک دو مثال دے دینا چاہتا ہوں، ایک مثال تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے واقعہ میں ہے اور ایک مثال حضرت حزن رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے اور یہ دونوں بخاری میں ہیں۔

بظاہر حکم مگر حقیقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عشق کا امتحان

صورتِ حال یہ ہوئی کہ جب صلح حدیبیہ کا معاملہ آیا، اس معاملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوایا ”ہذا ما قضی علیہ محمد رسول اللہ - (بخاری، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء، رقم: ۴۴۵۱، کتاب الصلح، باب کیف یکتب.....، رقم: ۲۶۹۹، مشکوٰۃ، کتاب الجہاد، باب الصلح، فصل ثالث، ص ۲۵۵) وہ صلح نامہ ہے جس پر محمد رسول اللہ نے مشرکین مکہ سے صلح کی تو جب ”ما قضی علیہ محمد رسول اللہ“ اس پارٹی نے دیکھا جو مشرکوں کی تھی انہوں نے کہا ہم آپ کو محمد رسول اللہ مانتے تو جھگڑا ہی کیا تھا؟ ہم آپ کو محمد رسول اللہ نہیں مانتے، آپ رسول اللہ کا لفظ یہاں سے کاٹ دیں، آپ یہ لکھیں ”ہذا ما قضی علیہ محمد بن عبد اللہ“ یہ وہ ہے جس پر محمد بن عبد اللہ نے صلح کی ہے، محمد بن عبد اللہ تو ہم آپ کو مانتے ہیں رسول اللہ نہیں مانتے تو لفظ رسول اللہ کاٹ دیں اور یہ لکھ دیں ”ہذا ما قضی محمد بن عبد اللہ“ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم مجھے رسول اللہ مانو یا نہ مانو، میں تو اللہ کا رسول ہوں، انہوں نے اصرار کیا کہ لفظ رسول اللہ کو کاٹ دیں ورنہ ہم کوئی بات نہیں کرتے، اب اللہ کا حکم ایسے ہی تھا کہ میرے پیارے جو یہ کہیں مانتے چلے جائیے، حکمت کا تقاضا یہی ہے۔

چنانچہ اللہ عزّوجل کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ عزّوجل کی وحی کے مطابق ان کی بات مانی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے علی لفظ رسول اللہ کو یہاں سے محو کر دو ”اھ رسول اللہ“ اب یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ ہے یا نہیں؟ ”اھ“ امر کا صیغہ ہے، اب یہ جو حضور نے امر فرمایا یہ کون سا تھا من جہت الرسالت تھا یا من جہت البشریت تھا؟

فیصلہ کرو، یہ جو امر تھا ”اٰمح“ اے علی اس کو محو کر دے، لفظ رسول اللہ کو مٹا دے اور یہاں ابن عبد اللہ کا لفظ لکھ دے، اب ”اٰمح“ جو امر فرمایا اگر اس کو من جہت الرسالت کہو تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انکار کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں تھا جو رسالت کی جہت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی حکم دیں، کوئی مسلمان انکار کر سکتا ہے؟ نہیں کر سکتا لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”اٰمح یا علی“ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا جواب دیا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ”لا واللہ لا احوک ابدًا“ (بخاری، کتاب المغازی، باب عمرة القضاء، رقم: ۲۴۵۱۔ کتاب الصلح، باب کیف یکتب.....، رقم: ۲۶۹۹، مشکوٰۃ، کتاب الجہاد، باب الصلح، فصل ثالث، ص ۳۵۵) میرے آقا میں قسم کھا کر کہتا ہوں لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مٹاؤں گا۔

اب آپ مجھے بتائیں کہ اللہ کے رسول کے حکم کو نہ ماننے کے لئے قسم کھانا کہ لفظ ”رسول اللہ“ کو نہیں مٹاؤں گا کیا یہ ایمان کی نشانی ہے؟ بتاؤ کیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم گنہگار ہوئے؟ نہیں ہوئے، کیوں؟

اس لئے کہ ”اٰمح“ کا حکم من جہت الرسالت نہیں تھا بلکہ من جہت البشریت تھا، آپ سمجھے اور حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم نے بیشک بظاہر اس امر کو، اس حکم کو نہیں مانا لیکن اس کے پس پردہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال تعظیم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال محبت کا رفرما تھی۔

ترک امر کی سزا رفع برکت

اب ایک اور بات بتاتا ہوں وہ بھی بخاری میں ہے۔ سعید بن مسیب، سعید تابعی ہیں، مسیب ان کے باپ صحابی ہیں اور مسیب کے باپ ہیں ”حزن“، سعید بن مسیب

روایت کرتے ہیں کہ میرے دادا حزن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور نے فرمایا ”ما اسمک؟“ آپ کا نام کیا ہے، انہوں نے عرض کیا میرا نام حزن ہے، حزن عربی زبان میں کہتے ہیں بڑی سخت زمین کو، جس میں بڑی سختی ہو اور صعوبت ہو۔ جب انہوں نے کہا میرا نام حزن ہے تو حضور نے فرمایا ”انت سهل“ تو حزن نہیں تو سہل ہے اور سہل کہتے ہیں نرم نرم زمین کو، جب حضور نے فرمایا ”انت سهل“ تو حضرت حزن نے جواب دیا ”لا اغیر اسمائے ابی“ (بخاری، کتاب الادب، باب اسم الحزن، رقم: ۶۱۹۰۔ مشکوٰۃ، کتاب الادب، باب الاسامی، فصل ثالث، ص ۴۰۹) عرض کی حضور میں تو وہ نام نہیں بدلوں گا جو میرے باپ نے رکھا ہے۔

اب بتائیے کہ حزن نے کہا میں نام نہیں بدلوں گا، اس پر حزن گنہگار ہوئے؟ اگر گنہگار ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیتے کہ تو نے میرے حکم کو رد کیا ہے تو عاصی ہے، گنہگار ہے۔ جب حضور نے اس پر خاموشی اختیار فرمائی تو معلوم ہوا اور حدیث تقریری سے ثابت ہو گیا کہ وہ گناہ نہیں تھا ورنہ ممکن نہیں ہے کہ حضور کے سامنے کوئی گناہ کرے اور حضور گناہ پر انکار نہ فرمائیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انکار کرنا وہ بھی گناہ نہیں تھا اور اس کی دلیل بھی یہی ہے کہ میرے آقا نے انکار نہیں فرمایا اور حضرت حزن رضی اللہ عنہ کا ”لا اغیر“ کہنا بھی گناہ نہیں تھا کیوں؟

دلیل یہ ہے کہ ان کے اس انکار کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہ نہیں قرار دیا اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہ نہیں قرار دیا تو معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم جہت رسالت سے نہ تھا بلکہ جہت بشریت سے تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل نہیں کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا برکت سے محروم ہونے کا معاملہ بھی نہیں آیا کیوں؟ اس

لئے کہ وہاں محبت اور عظمت پس پردہ کار فرما تھی مگر حضرت حزن رضی اللہ عنہ نے حضور کا حکم جو بشریت کی جہت سے تھا اس کو انہوں نے نہیں مانا، وہ گنہگار تو نہیں ہوئے کیونکہ وہ حکم جہت بشریت سے تھا جہت رسالت سے نہیں تھا وہ گنہگار تو نہیں ہوئے مگر حکم نہ ماننے کی وجہ سے بہت بڑی برکت سے محروم ہو گئے اور وہ کیا ہے؟

حضرت سعید ابن مسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میرے دادا نے کہا کہ حضور یہ حزن نام تو میرے باپ نے رکھا ہے اور جو نام میرے باپ نے رکھا ہے میرے آقا میں اسے بدلنا نہیں چاہتا تو فرماتے ہیں ”فما زالت فینا الحزونت بعد“ اس کے بعد ہمیشہ ہمارے اندر انتہائی سختی اور شدت رہی اور سختی ہم پر چھا گئی، سختی میں ہم مبتلا ہو گئے اور بڑی شدت ہم پر طاری رہی، کیوں؟

اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم انہوں نے انکار کر دیا تھا اگرچہ گنہگار تو نہیں ہوئے کیونکہ وہ حکم من جہت الرسالت نہیں تھا مگر وہ حکم جو من جہت البشریت تھا اس کے نہ ماننے سے بھی وہ اس برکت سے محروم ہو گئے جو برکت ان کو حاصل ہو سکتی تھی، وہ سختی اور صعوبت اور شدت ان کے اندر ہمیشہ باقی رہی۔

عزیزان محترم! یہ فرق میں نے آپ کو بتا دیا کہ یہ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بات میں تمہیں اللہ عز وجل کی طرف سے کہوں وہ مانو اور جو اپنی طرف سے کہوں تو میں بشر ہوں، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہونے کی جہت سے جو کام کریں یا جو بات فرمائیں اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غلطی ہوتی ہے یا گناہ ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں، مطلب یہ ہے کہ تمہاری سہولت ہوتی ہے تمہیں گناہ سے بچانا مقصود ہوتا ہے، ہر بات اگر جہت رسالت سے کہی جائے تو پھر تم بہت جلد بند یوں میں مبتلا ہو جاؤ گے، بہت سے

گناہوں میں مبتلا ہو سکتے ہو، لہذا جو بات میں جہت رسالت سے کہوں وہ تو ضرور تمہارے لئے قبول کرنا ضروری ہے اور جو بات بشریت کی جہت سے کہوں اگر تم اس کو قبول نہیں بھی کرو گے تو کم از کم گنہگار نہیں ہو گے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات برکت سے محروم ہو جاؤ لیکن گناہ نہیں ہوگا، یہ تو میرے آقا نے امت کو سہولت کے لئے بات ارشاد فرمائی تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ معاذ اللہ حضور سے غلطی ہوتی ہے۔ استغفر اللہ

کس جہت سے فرمایا؟ اس کا فیصلہ کیسے

لو بھائی! آخری بات کہہ کر میں یہ مسئلہ ختم کر دوں، یہ جو کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بات میں رسالت کی طرف سے کروں وہ مانو اور جو بشریت کی طرف سے کروں اس کا ماننا ضروری نہیں ہے۔ پہلے تو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ بشریت کبھی رسالت سے الگ ہوتی ہے؟ کوئی ایسا مقام دکھاؤ کہ رسالت الگ رکھی ہو اور بشریت الگ؟ جب الگ نہیں ہوتی تو اب یہ فیصلہ کون کرے گا کہ یہ بات رسالت کی جہت سے ہے یا بشریت کی جہت سے ہے؟

بتائیے! ارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کریں گے ناں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کیونکہ انکار نہیں فرمایا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ تھا۔ حدیث تقریری تھی حضرت حزن رضی اللہ عنہ کے معاملے میں بھی فیصلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار نہیں فرمایا ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فوراً ان کی معصیت کا اظہار فرما دیتے تو ہمیں اس بات کا پتہ چل گیا کہ یہ بات جہت بشریت سے ہے، بشریت الگ نہیں، رسالت الگ نہیں، ایک ہی زبان پاک سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بات فرماتے ہیں اور اسی زبان پاک سے رب کی بات فرماتے ہیں اب یہ کیسے پتہ چلے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

اپنی بات فرمائی یا رب کی؟ ایمان سے کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سے ہی پتہ چلے گا ناں کہ یہ بات رسالت کی جہت سے ہے اور یہ بات بشریت کی جہت سے ہے تو پتہ چلا کہ دار و مدار تو پھر بھی رسول پر رہا تو اگر رسول کی ذات پاک پر اعتماد نہیں ہے تو یہ پتہ نہیں چلے گا کہ یہ بات جہت رسالت سے ہے یا جہت بشریت سے ہے، حضور زبانِ اقدس سے جو فرمائیں گے اسی پر اعتماد کرنا پڑے گا۔

بات یہاں ختم ہوتی ہے کہ خدا کی ہستی پر ایمان ہو یا قرآن پر ایمان ہو، یقین پر ایمان ہو یا شریعت پر ایمان ہو، ہر ایمان کی بنیاد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک ہے جب تک مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک کو ہم قابلِ اعتماد نہیں مانیں گے یعنی ان کی زبان مبارک کو بھی غلطی سے پاک مانیں، ان کی نظر پاک کو بھی غلطی سے پاک مانیں، ان کو معصوم مانیں، ان کو ہر عیب و خطا سے پاک مانیں، جب تک ہمارا اعتماد اس نوعیت سے رسول پاک کی ذات پر نہیں ہوتا، نہ توحید کا عقیدہ ہاتھ آتا ہے، نہ قرآن پر ایمان ہاتھ آتا ہے نہ دین ہاتھ آتا ہے نہ شریعت ہاتھ آتی ہے، سب کچھ ہاتھ سے جاتا ہے۔ اگر رسول کی ذات کا اعتماد چلا گیا تو سب کچھ ہاتھ سے چلا گیا، اسی لئے ہم اس پر زور دیتے ہیں۔ ہم حضور کو معاذ اللہ خدا نہیں کہتے خدا کا شریک نہیں، خدا کا بیٹا نہیں کہتے، خدا کا جز نہیں کہتے، خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو ایسا قابلِ اعتماد بنایا کہ ہر بات رسول کے حوالے کر دی۔ پیارے! قرآن بھی تیرے حوالے، میری توحید بھی تیرے حوالے، میرے احکام بھی تیرے حوالے، سارا دین بھی تیرے حوالے، میرے محبوب! تیری زبان پر اعتماد ہوگا تب ہی ان کو دین نصیب ہوگا، تیری بات پر اعتماد ہوگا تب میرا کلام نصیب ہوگا، تیری ذات پر اعتماد ہوگا تو تب ان کو توحید کا عقیدہ نصیب ہوگا، اگر تجھ پر اعتماد نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔

اذان کے ساتھ درود و سلام کا مسئلہ

اب رہا یہ سوال کہتے ہیں کہ تم اذان سے پہلے صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہو اور اذان کے بعد بھی پڑھتے ہو تو یہ کہیں حدیث میں ہے؟

حالانکہ دونوں چیزیں حدیث میں موجود ہیں۔ حدیث سے ظاہر ہے کہ ہر نیک کام سے پہلے درود پڑھو تو تمہیں ثواب ملے گا

”کل امر ذی بال لا یبدا فیہ بحمد اللہ والصلوٰۃ علیٰ فہو اقطع ابتر

محموق من کل برکۃ“ (جامع صغیر، امام سیوطی، ج ۲، ص ۹۱، رقم: ۶۳۸۵، کنز العمال، رقم: ۲۰۵۷)

ہر اہم کام جس سے پہلے حمد و صلوٰۃ نہ پڑھی گئی تو وہ (حمد و صلوٰۃ سے ملنے والے) ہر ثواب سے خالی ہوگا۔ تقریر و تحریر سے پہلے اس حدیث پر علماء امت کا عمل ہے اور یہ تعلق بالقبول ہے جس کے بعد سند صحیح کی ضرورت نہیں رہتی۔ (رہاوی، ابن مدینی، ابن مندہ وغیرہ نے اپنی سندوں سے یہ مضمون روایت کیا، سندوں میں کمزوری موجود ہے۔ ضعیف روایت سے بھی فعل کی فضیلت لی جاتی ہے) فرض نہیں ہے، واجب نہیں ہے۔ اب بتاؤ اذان نیک کام ہے یا بد کام ہے؟ یقیناً نیک کام ہے تو نیک کام سے پہلے ثواب حاصل کرنے کے لئے درود پڑھنے کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے فرمایا کہ ہر نیک کام سے پہلے درود پڑھو۔

آپ کہیں گے کہ یہ تو پہلے کی بات ہے بعد کی کہاں ہے؟ اگر بعد کی بات پوچھتے ہو تو وہ تمام حدیثوں میں موجود ہے۔ حضور نے فرمایا کہ جب مؤذن اذان ختم کرے تو مجھ پر درود پڑھے، پھر دعائے وسیلہ پڑھے۔

(مشکوٰۃ البانی، کتاب الصلوٰۃ، باب فضل الاذان واجابۃ المؤذن، رقم: ۶۵۷۷۔ مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب استحباب القول مثل قول المؤذن: رقم ۸۴۹۔ ابوداؤد ج ۱، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یقول اذا سمع المؤذن، رقم: ۵۲۳۔ نسائی، کتاب الاذان، باب الصلوٰۃ علی النبی بعد الاذان، رقم: ۶۷۹)

مسلم شریف میں حدیث ہے، ابوداؤد شریف، ترمذی شریفؒ اور ابن ماجہ شریف میں حدیث ہے کہ جب اذان ختم ہو تو فوراً مجھ پر درود پڑھو، دعا بعد میں مانگو۔
اب کہتے ہیں ہم اس لئے روکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا، صحابہ نے ایسا نہیں کیا۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ ہر نیک کام سے پہلے درود پڑھو تو ثواب ہوگا اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ جب اذان ختم ہو تو دعائے وسیلہ بعد میں مانگو میرے اوپر درود پہلے پڑھو، اب یہ کہنا کہ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور نہ صحابہ سے ثابت ہے تو اس کا مطلب ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان صحابہ نے بھی نہ مانا؟

پھر کہتے ہیں کہ بھئی بلند آواز سے نہیں ہوتا تھا، تم بلند آواز سے کیوں پڑھتے ہو؟
بھئی ہم نے کب کہا کہ بلند آواز سے پڑھنا ضروری ہے، ہم تو بلند آواز سے اس لئے پڑھتے ہیں کہ لوگ بھی سن کر پڑھنے لگیں گے، اگر ہم چپکے سے پڑھیں تو کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا، اگر بلند سے پڑھیں گے تو جس کو آواز پہنچے گی وہ بھی درود پڑھنے لگے گا تو ہمارا بلند آواز سے پڑھنا دوسروں کے درود پڑھنے کا وسیلہ بن جائے گا اگر دوسروں کے پڑھنے کے لئے کوئی کام وسیلہ بن جائے تو اس میں کون سی خرابی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ بلند آواز سے پڑھنا فرض ہے، واجب ہے، اگر نہیں پڑھو گے تو گنہگار ہو جاؤ گے یا تم شریعت کے حکم کے تارک ہو جاؤ گے۔ ارے! ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ مستحب ہے، ثواب ہے، خود بھی بلند آواز سے پڑھ لو، تمہاری آواز سن کر کوئی دوسرا مسلمان بھی درود پڑھ لے گا تو بہت اچھا ہو جائے گا۔ اگر ہم فرض واجب کہیں تو ہم پر الزام لگاؤ، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ہر نیک کام سے پہلے پڑھنا ثواب ہے اور اذان کے بعد درود پڑھنا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، جو بلند آواز کا

ہم پر اعتراض کرتے ہیں وہ پست آواز سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہیں پڑھتے، ہم کوئی آواز کو ضروری نہیں کہتے، فرض واجب نہیں کہتے، بس اس کے سوا کچھ نہیں، لہذا بات ختم ہوگئی۔

اب رہا یہ کہ اگر اذان سے پہلے درود پڑھنا اذان میں زیادتی ہے، اضافہ ہے۔ میں کہتا ہوں جو چیز ہر مسلمان کے نزدیک کسی دوسری چیز کا جز نہیں، اگر دونوں کو ملا کر پڑھ لیا جائے تو کیا وہ ایک چیز دوسرے کا جز بن جائے گی؟ ہر نماز میں الحمد کے ساتھ ثناء پڑھتے ہیں، ملا کر پڑھتے ہیں یا وقفہ کرتے ہیں؟ ملا کر پڑھتے ہیں، اگر آپ ثناء کو سورۃ فاتحہ کے ساتھ ملا کر پڑھتے ہیں تو ثناء کو کوئی بھی سورہ فاتحہ کا جز نہیں سمجھتا۔ سب جانتے ہیں کہ یہ ثناء ہے، یہ فاتحہ ہے، تو اگر ثناء سورہ فاتحہ کے ساتھ ملانے سے ثناء سورہ فاتحہ کا جز نہیں ہوگا تو اگر درود اذان کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو کیسے جز ہو جائے گا؟

ایک اور بات پوچھتا ہوں! تشهد ”اشھدان لا الہ الا اللہ واشھدان محمداً عبداً ورسولہ“ پر ختم ہوتا ہے، آپ اس کے فوراً بعد درود پڑھتے ہیں یا ٹھہر کے پڑھتے ہیں؟ فوراً پڑھتے ہیں تو وہ تو تشهد کا جز ہو گیا تو کبھی آپ نے یہ سوچا کہ ہم ملا کر پڑھ رہے ہیں وہ درود ہے یہ تشهد ہے۔ اگر ملا کر پڑھنے سے درود تشهد کا جز نہیں ہوتا تو درود اذان کا جز کیسے ہو جائے گا؟ امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک بسم اللہ سورہ فاتحہ کا جز نہیں ہے، اعوذ باللہ بھی ملا کر پڑھ دیں تو بھی جز نہیں ہے، ثناء کو ملا کر پڑھ لیں، ثناء بھی جز نہیں ہے، التحیات کے بعد فوراً درود پڑھ دیں، وہ بھی التحیات کا جز نہیں ہے۔ یہ ساری چیزیں ملا کر پڑھی جائیں تو ایک دوسرے کا جز نہیں بنتیں تو درود و سلام اذان کا جز کیسے بن جائے گا؟ بہر حال کیا تماشہ ہے یہ سب لیت و لعل ہے، کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس میں دلیل شرعی کی خلاف ورزی ہو بلکہ دلیل شرعی موجود ہے کہ نیک کام سے پہلے درود پڑھنے کا

حکم موجود ہے اور اذان ختم ہوتے ہی درود پڑھنے کا حکم موجود ہے۔ □
عزیزانِ محترم! میں نے یہ اس لئے عرض کر دیا کہ ہم صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہیں۔
درودِ ابراہیمی کے سوا کوئی درود نہ پڑھیں؟
ایک سوال اور آیا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ درودِ ابراہیمی کے علاوہ اور کوئی درود نہیں
پڑھنا چاہیے۔

عرض ہے کہ پھر تو حدیثوں میں تمام درود کاٹ دو "قال قال رسول اللہ
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم" کیا یہ درودِ ابراہیمی ہے؟ ہر حدیث میں قال قال
رسول اللہ کے بعد کیا ہے؟ اگر درودِ ابراہیمی کے علاوہ کوئی درود جائز نہیں ہے تو پھر ہونا
چاہیے "عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
وعلیٰ آل محمد کما صلیت علیٰ ابراہیم و علیٰ آل ابراہیم انک حمید
مجید" ہر حدیث میں یہ ہونا چاہیے یا نہیں؟ مگر کسی ایک حدیث میں دکھاؤ؟ ہر حدیث
میں قال قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے۔ اب بتاؤ "صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم" کیا
ہے؟ بخاری پڑھاتے ہو، مسلم و ترمذی پڑھاتے ہو، ہر حدیث میں درودِ ابراہیمی پڑھاؤ
کیونکہ دوسرا درود تو تمہارے نزدیک جائز نہیں، تمام حدیثوں میں یہ درود نکالتے جاؤ اور
درودِ ابراہیمی لگاتے جاؤ۔

یہی تو دلیل ہے میری کہ جس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا وہ منع
نہیں ہے، ارے درودِ ابراہیمی کے سوا کسی درود کا پڑھنا حضور نے منع نہیں فرمایا لہذا کوئی
درود منع نہیں ہے۔ جب میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان سے اول و آخر کو درود سے منع نہیں
فرمایا تو وہ کیسے منع ہو جائے؟

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین